تاریک سیّارہ

اختر الایمان

بار اول پانچسو

قیمت چھ روپے

پتہ ادارہ ترقی اردو، حیدر آباد

کوہ نور پرنٹنگ پریس، دہلی

زلفیہ کے نام ——

جو اس تاریک سیارہ کی مخلوق نہیں !

فہرست مضامین

آبادی

بگولے اٹھتے تھے عنوانِ خاکِ ویرانہ
نہ شورِ بزمِ طرب تھا نہ دورِ شمعِ جمال
زمیں کے سینۂ سوزاں پہ کوئی بار نہ تھا
بہارِ یاسمن و لالہ کا شکار نہ تھا

کہیں سے آئے بگولوں کے ساتھ خانہ بدوش
نگاہِ سوزِ جوانی نے کاروبار کیا
بنائے رنگ، محلِ استخوان و اخستا پر
بہارِ یاسمن و لالہ کو شکار کیا
مرودِ نالہ اٹھا رقصِ ناتواں کے لیے
چھلکتے جام نے رندوں کا انتظار کیا

لہو تڑپ کے تھپکنے لگا شبستاں میں
ہوا کسی کو محبت کا امتحاں مقصود
تفنگ و تیر کی منزل پہ آیا عشق خموش
خمار بڑھنے لگا مستیاں شکار ہوئیں
دہل بجا تو حدودِ مکاں شکار ہوئیں!

غبارِ راہ بنا کارواں کا سرمایہ
فضائے دشت میں پھیلا ہوا تھا رنگِ ملال
بگولے اٹھتے تھے عنوانِ خاکِ وبادیہ
نہ شورِ بزمِ طرب تھا نہ دورِ شمعِ جمال

....

جبر

زرد پتوں کا وہی ڈھیر، وہی دورِ خزاں
خشک شاخیں ہیں ابھی منتظرِ فصلِ بہار
مرگِ انبوہ سے کچھ کم تو نہیں ہے یہ سماں
کتنا جانکاہ تسلسل ہے، وہی لیل و نہار

اس قدر ناز نہ کر پھولوں سے رخساروں پر
زندگی بھیک ہے، جو جبرِ مشیّت سے ملی
حسنِ بے مایہ ملا تجھ کو، مجھے تشنہ دلی
ہم بھکاری ہیں، بھکاری کی حقیقت کیا ہے!

ایک کشکولِ گدایانہ لیے پھرتے ہیں
منظرِ عام پہ، ویرانوں میں، آبادی میں،
سب ہی بے بس ہیں سبھی ہونٹ سیئے پھرتے ہیں

اپنی مجبوری کا شاید تجھے احساس نہیں،
ایک دھندلی سی کرن بھی نہ ملے، مانگے سے
لب ہلائیں تو یہ سورج، یہ قمر بھی چھن جائے
ہاتھ اٹھائیں تو دعاؤں سے اثر بھی چھن جائے
اشک چھن جائیں نگاہوں سے حرارت چھن جائے
ظلم پروردہ جوانی سے محبت چھن جائے
حسن اک ٹیس کی صورت میں بدل کر رہ جائے
ظلمتِ یاس میں اک آہ مچل کر رہ جائے

پس منظر

کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر
یونہی چند پرانی قبریں کھود رہا ہوں چپ کا بیٹھا
کہیں کسی کا ماس نہ ہڈی، کہیں کسی کا روپ نہ چھایا
کچھ کتبوں پہ دھندلے نام کھدے ہیں، میں جیون بھر
ان کتبوں، ان قبروں ہی کو اپنے من کا بھید بنا کر،
مستقبل اور حال کو چھوڑے دکھ سکھ سب میں لیے پھرا ہوں
ماضی کی گھنگھور گھٹا میں چپ کا بیٹھا سوچ رہا ہوں
کس کی یاد چمک اٹھی ہے دھندلے خاکے ہوئے اجاگر؟

بیٹھا قبریں کھود رہا ہوں۔ ہوک سی بن کر ایک اک مورت
درد سا بن کر ایک اک سایا، جاگ رہے ہیں۔ دور کہیں سے
آوازیں سی کچھ آتی ہیں، "گزرے تھے اک بار یہیں سے"
حیرت بن کر دیکھ رہی ہے، ہر جانی پہچانی صورت۔
گویا جھوٹ ہیں یہ آوازیں کوئی میل نہ تھا ان سب سے
جن کا پیار کسی کے دل میں اپنے گھاؤ چھوڑ گیا ہے
جن کا پیار کسی کے دل سے سارے رشتے توڑ گیا ہے
اور وہ پاگل ان رشتوں کو بیٹھا جوڑ رہا ہے کب سے!

میری نس نس ٹوٹ رہی ہے بوجھ سے ایسے درد کے جس کو
اپنی روح سمجھ کر اب تک لیے لیے پھرتا تھا ہر سو
لیکن آج اڑی جاتی ہے اس مٹی کی سوندھی خوشبو
جس میں آنسو بوئے تھے میں نے، بیٹھا سوچ رہا ہوں، جن کو
ان کتبوں کو ان قبروں میں دفن کروں اور آنکھ بچا لوں
اس منظر کی تاریکی سے ابھرے جو ائے وہ اپنا لوں

اعتراف

چند لمحے جو ترے ساتھ گزارے ہیں نے
ان کی یادان کا تصور بھی میرے پاس نہیں
تو ابھی چھائی نہیں مجھ پہ مری دنیا پر
خود ترا حسن مرے ذہن میں تابندہ نہیں
کیا خبر کل مجھے یکسر ہی بدل ڈالے تو
یوں ترا حسن مرا شوق بھی پائندہ نہیں
دیکھو میں ہوش میں ہوں اے غمِ گیتی شعور
تیرے ملنے کی تمنّا لیے آنکھوں میں کہاں
اپنے ظلمت کدے اے جان سنوارے میں نے؟

غم پوشیدہ مرے جذبات میں وہ جذب نہاں
اب کہاں، پہلے گزاریں کئی راتیں میں نے
جن میں افسانے کہے چاند سے افسانے سنے
اب کہاں، پہلے، برس گزرے کسی مہوش کی
چاہ میں، کتنے ہی ہنگام سحر گیت بنے!
اب مگر تاب کہاں مجھ میں، یہ انگور کی بیل
خون چاہے گی رگ و پے میں سما جائے گی
بس تجھے کیسے جگاؤں گا کہ بیدار ہے تو،
ہاں تری یاد مرے ذہن پہ چھا جائے گی؟
اب میں اس نشہ سے گھبرانے لگا ہوں اے جاں
روح معدوم ہے، ٹھوکر کوئی کھا جائے گی!

دو تری گود میں یا قبر کی تاریکی ہو
اب مجھے نیند کی خواہش ہے سو آجائے گی

انجان

تم ہو کس بن کی پھلواری اتا پتا کچھ دیتی جاؤ!
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو، میں کیا جانوں میں ہوں کون

چلتا پھرتا آپہنچا ہوں، راہی ہوں، متوالا ہوں
ان رنگوں کا جن سے تم نے اپنا روپ سجایا ہے
ان رنگوں کا جن سے تم نے اپنا کھیل رچایا ہے
ان گیتوں کا جن کی دھن پر ناچ رہے میرے پران
ان لہروں کا جن کی ندیوں ڈوب گیا ہے میرا من

میرا روگ مٹانے والی اتا پتا کچھ دیتی جاؤ!
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو، میں کیا جانوں میں ہوں کون!

میں ہوں ایسا راہی جس نے دیس دیس کی آہوں کو
لے لے کر پروان چڑھایا اور رسیلے گیت بُنے
چنتے چنتے جگ کے آنسو اپنے دیپ بجھا ڈالے
میں ہوں وہ دیوانہ جس نے پھول لٹائے خار چُنے
میرے گیتوں اور پھولوں کا رس بھی سُوکھ گیا تھا آج
میرے دیپ اندھیرا بن کر روک رہے تھے میرے کاج
ننھی جوت جگانے والی اتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو میں کیا جانوں میں ہوں کون!

ایک گھڑی اک پل بھی سکھ کا امرت ہے اس راہی کو
جیون جس کا بیت گیا ہو کانٹوں پر چلتے چلتے
سب کچھ پایا پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں جو پائی دنیا
اس نے جس کی بیت گئی ہو برسوں سے جلتے جلتے
میرا درد بٹانے والی اتا پتا کچھ دیتی جاؤ
مجھ سے میرا بھید نہ پوچھو میں کیا جانوں میں ہوں کون!

جب اور اب

کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت میں گدگدی سی تھی لوریوں کی
نئی نئی کونپلوں کی سرخی نئے شگوفوں کی تازگی تھی
کہاں تو یہ تھا کہ میری چاہت نئی گیت اٹھتی جوانیوں کا
کہاں یہ دن ہے کہ تیری آواز بن گئی ہے صدائے صحرا
نہ جانے کس گوشۂ زمیں سے رُکی رُکی سی تھمی تھمی سی
گھٹی گھٹی سی ہزار پردوں سے آج چھن چھن کے آ رہی ہے

اتفاق

دیارِ غیر میں کوئی جہاں نہ اپنا ہو
شدید کرب کی گھڑیاں گزار چکنے پر
کچھ اتفاق ہوا ایسا کہ ایک شام کہیں،
کسی اک ایسی جگہ سے ہو یونہی میرا گزر
جہاں ہجومِ گریزاں میں تم نظر آجاؤ
اور ایک ایک کو حیرت سے دیکھتا رہ جائے

اجنبی

تو ہے کچی کونپل اب تک جس کے لوچ میں پیار ہی پیار
اور میں گرمی سردی چکھے ڈالی پہ اک تنہا پات
تو سچا موتی، میں ہیرا، بکھرا جو برسوں ہاتھوں ہاتھ
تو اوشا کی پہلی کرن ہے اور میں جیسے بھیگی رات
تو تاروں کے نور کی دھارا، میں گہرا نیلا آکاش
میں ہوں جیسے ٹوٹا نشہ، تو ہے جیسے شاخِ نبات
تو ہے اک ایسی شہنائی جس کی دھن پر ناچے موت
تیری دنیا جیت ہی جیت ہے، میری دنیا چھوڑ یہ بات

تو ہے ایک پہیلی جس کو جو بوجھے سو جان سے جائے

تو ہے ایسی مٹی جس سے لاکھوں پھول چڑھیں پروان

آئیں تیرا رنگ کبھی چھو دوں چھوڑ یہ بھید بھاؤ کی بات

میں نے وہ سرحد چھو لی ہے جہاں امر ہو جائیں پران

اے آنکھوں میں کھلنے والی جانے کون کہاں رہ جائے

جیون کی اس دوڑ میں پگلی ہم دونوں ہیں آج انجان

لیکن اے سپنوں کی دنیا تو چاہے تو روگ مٹیں

میں نے دنیا دیکھی ہے تو میری باتیں جھوٹ نہ جان

جیون کی اس دوڑ میں ناداں یاد اگر کچھ رہنا ہے

دو آنسو، اک دبی ہنسی، دو روحوں کی پہلی پہچان

....

عہدِ وفا

یہی شاخ تم جس کے نیچے کسی کے لیے چشمِ نم ہو، یہاں اب سے
کچھ سال پہلے مجھے ایک چھوٹی سی بچی مِلی تھی جسے میں نے آغوش
میں لے کے پوچھا تھا، بیٹی یہاں کیوں کھڑی رو رہی ہو، مجھے اپنے
بوسیدہ آنچل میں پھولوں کے گہنے دکھا کر، وہ کہنے لگی میرا ساتھی،
اُدھر، اس نے انگلی اٹھا کر بتایا، ادھر اس طرف ہی
(جدھر اونچے محلوں کے گنبد، ملوں کی سیہ چمنیاں آسماں کی
طرف سر اٹھائے کھڑی ہیں)
یہ کہہ کر گیا ہے کہ میں سونے چاندی کے گہنے ترے واسطے
لینے جاتا ہوں رانی!

تبدیلی

اس بھرے شہر میں کوئی ایسا نہیں
جو مجھے راہ چلتے کو پہچان لے
اور آواز دے "او بے او سر پھرے"
دونوں اک دوسرے سے لپٹ کر وہیں
گرد و پیش اور ماحول کو بھول کر۔
گالیاں دیں، ہنسیں، ہاتھا پائی کریں۔
پاس کے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر
گھنٹوں اک دوسرے کی سنیں اور کہیں
اور اس نیک روحوں کے بازار میں
میری یہ قیمتی بے بہا زندگی
ایک دن کے لیے اپنا رُخ موڑ لے!

سجدہ

سیاہ رات بس اب ٹوٹنے ہی والی ہے!
ہوا ہی چاہتا ہے دامن و گریباں چاک
اس آفتابِ سرِ آسمانِ الفت کا
ملا ہی چاہتا ہے بیقراریوں کو سکوں
کھلا ہی چاہتا ہے آبلوں پہ رنگِ حنا

خطِ افق پہ ابھی تیرگی ہے تھوڑی سی!
سیاہ پردے نگاہوں سے اٹھتے جاتے ہیں
غبار سا تھا سرِ راہ وہ بھی کچھ کم ہے

وہ سرخ سرخ شفق لے رہی ہے انگڑائی
یہ میری آنکھ خدا جانے آج کیوں نم ہے؟

لہو پکار رہی دیگا شہیدِ منزل کا!
تھکی ہوئی تھیں نگاہیں پناہ چاہی تھی
اسی گھڑی کا، اسی دن کا انتظار بھی تھا
کوئی شریر کرن بڑھ کے چوم ہی لے گی
جبینِ شوق میں اک سجدہ بے قرار بھی تھا

....

تعمیر

یں بھی تعمیر اک جہان کروں
بستیاں چند، غم کے مارے چند
مہ و خورشید اور تارے چند
ٹوٹنے والے ہوں سہارے چند

روشنی تیرگی میں کھو جائے
زندگی روتے روتے سو جائے
یہ حکایت دراز ہو جائے

بے کسی کا چراغ جلتا ہو
موت کے غم سے جی بہلتا ہو
رنگ زاروں میں خوں مچلتا ہو

آسماں سے ہو کلفتوں کا نزول
لوٹ آئے دعا خموش و ملوّل
کھلنے پائے کبھی نہ بابِ قبول!
میں بھی تعمیر اک جہان کروں!

....

واپسی

خاموش ہے، گنگ ہے، سیہ پوش!
ماضی کے محل کے نرم دیوار
لوٹا نہیں بے حسی کا پندار
چھوڑا تھا اسی محل کے پیچھے
احباب کو صرفِ نغمہ و ساز
رکھتے تھے شرارتوں کی بنیاد
ہوتا تھا محبتوں کا آغاز
لوٹا ہوں تو محفلیں ہیں خاموش
آتی نہیں قہقہوں کی آواز

زنداں کی حدوں میں کھو گئے ہیں
دیوانے بہل کے سو گئے ہیں

دروازوں پہ دے رہا ہوں آواز
خاموش ہے گنگ ہے، سیہ پوش
ماضی کے محل کی نرم دیوار!
پھیلائے ہوئے زمیں ہے آغوش
تاریکی میں ڈھونڈتا ہوں راہیں
سورج کو ترس گئیں نگاہیں

....

دستک

کھٹکھٹاتا ہے درِ بستہ کوئی!
انتظار، اشک، گماں، کچھ بھی نہیں
شمع، پروانے، دھواں، کچھ بھی نہیں

سوچ لوں باز کروں در، نہ کروں
شیشہ وسنگ کی جھنکار سنوں
آج کیا کہتے ہیں غم خوار سنوں!

اِس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا
اس سے پہلے بھی یہ دروازہ کھلا

قیامت

بارگاہِ لافانی
بے خبر ہے جانے کیوں؟
ایک اشکِ بے مایہ
معتبر ہے جانے کیوں؟

ہم نفس دعا مانگیں!
"روشنی کے مینارے
ماہ و آسماں تارے
ٹوٹ کر بکھر جائیں"

کوہ و دشت و دریا سے
کانپتی صدا اٹھے
"اے خدائے لافانی
مختصر جہانبانی"

مدتوں کی تاریکی ۔
روشنی سے دھل جائے
چشمۂ بقا پھوٹے!
آسمانِ تازہ ہو
آفتابِ تازہ ہو
زندگی کے شانوں پر
موت کا جنازہ ہو

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینک دو اس کا جسمِ خاکی
یہ سیمگوں نرم نرم کرنیں
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حُسنِ گمنام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے
جوان، دلکش، حسین چہرے سے چھین لی غم نے تابناکی

کھلی ہوئی بدنصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے

اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخرش راندۂ جہاں سے زمیں کی آغوش نے وفا کی
اسی لیے کیا اگا کر بیج گئے
یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ جو کہ آئے روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلا دیں گے

خاکداں

خدائے شاہد، بلند و برتر!
مناظر اس تیرے خاکداں میں
محبتوں کے لطیف دامن
مسرتوں سے بھرے ہوئے ہیں
یہ وادیاں ہیں گلوں کا مسکن؟

مناظر اس تیرے خاکداں میں
زمیں کے سینے سے پھوٹتے ہیں
نئے شگوفے، نئی بہاریں

فرازِ کوہ گراں سے گرتی،
ہیں تند اور تیز آبشاریں؛
مگر یہ کیا دیا ہے تو نے؟
شباب اک زہر میں بجھا کر
خراب آنکھیں لہو رلا کر
خدائے عالم، بلند و برتر!
نہ ایک مونس بھی ایسا بخشا
کہ جس کی آغوش میں تڑپ کر
سکون کے ساتھ مر سکوں میں

....

پہلی کرن

"صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی"
تاروں بھری حسین رات، نرم رواں جوان شام
کھوئی ہوئی سی اک ہنسی، بھولا ہوا سا اک خرام
موت کی وادیوں میں گم ہو گئی پھر وہ نغمگی
فرشِ زمیں پہ خار و خس پر تو خور سے جاگ اٹھے
شعلہ و دود جاگ اٹھے آہن و سنگ جاگ اٹھے
رنج و الم کے شاہکار لے کے امنگ جاگ اٹھے
جاگ اٹھے ہیں قہقہے، تیز، بلند قہقہے
رات کی خوابگاہ میں بجھ گئے شب چراغ پھر
پہلی کرن کے ساتھ ساتھ جاگ اٹھے دبے داغِ کہن

تجھے گماں ہے...

تجھے گماں ہے مری محبت ترے کرم سے جواں رہے شاید
مری جوانی، تری جوانی کی بے رخی کا شکار ہو گی؟
مرا لہو میرے اشک بن کر سیاہ راتوں کی نذر ہو گا،
یہ وسعتِ کائنات شاید حکایتِ انتظار ہو گی؟

مرے لبوں پر سلگ رہا ہے طویل زلفوں کا ایک بوسہ
ترے تبسّم کی یاد باقی ہے زہر کے گھونٹ پی رہا ہوں؟
مرے تخیّل کی تنگ دنیا ترے تصوّر سے ہے فروزاں
تجھے گماں ہے کہ میں ابھی تک تری تمنّا میں جی رہا ہوں؟

تجھی سے سیکھا ہے میرے نغموں نے سنگِ آہن کو موم کرنا
ترے لبوں کی شگفتگی سے ہی میرے شعروں میں تازگی ہے؟
تری ہی پرکار سادگی سے مرے جہاں میں ہے حشر برپا
ترے ہی دلکش، حسین چہرے سے میری آنکھوں میں روشنی ہے

یہ شورشِ غم، جنونِ پیہم، مرے لیے کچھ نئے نہیں ہیں
تجھے گماں ہے گزر رہا ہوں میں تیری الفت کے امتحاں سے؟
تجھے مری سخت کوشِ فطرت سے جانِ غم آگہی نہیں ہے
تجھے گماں ہے کہ اب میں شاید نہ اٹھ سکوں تیرے آستاں سے؟
تری محبت بھری نگاہوں کی دلکشی بھولتا نہیں ہوں
اگر ترا آستاں نہ چھوٹے، گماں ہے، میں نقشِ پا نہیں ہوں

....

سلسلے ٹوٹ گئے...

ہٹ گیا رات کے چہرے سے ستاروں کا کفن
سبزہ و گل پہ ابھی تک ہے وہی پہلا نکھار
صبح کی آنکھ میں انگڑائیاں لیتا ہے خمار

دن کے ہمراہ چلا قافلۂ رنگ و بہار!
سینۂ خاک پہ رقصاں ہے وہی روحِ حیات
وہی کلیوں کی خموشی، وہی غنچوں کا ثبات

نورِ خورشید سے ذرّوں کی جبیں روشن ہے!

دشت و کہساریں ہے پھر وہی کرنوں کا خرام
پھر وہی شورِ وہی کشمکشِ دانہ و دام

پھر اسی مرکزِ آلام پہ لوٹ آیا ہوں
پھر وہی حسن سے حیوان کی چارہ جوئی
پھر وہی انسان سے انسان کی چارہ جوئی

سلسلے ٹوٹ گئے خواب کی زنجیروں کے!
میری پلکوں پہ ستارے سے لرز کر ٹوٹے
اس کے ہونٹوں پہ سہارے سے لرز کر ٹوٹے!

....

تجدید

ایک بار پہلے بھی نغمہ بار ٹہنیں شاخیں
برگ و بار آئے تھے، نخل پھول لایا تھا
لد گئی تھی پھولوں سے خاکِ بے سروساماں
ایک بار پہلے بھی میں نے گھر سجایا تھا

ایک بار پہلے بھی قافلے بہاروں کے
اوڑھ کر ردائے گل اس طرف سے گزرے تھے
آپ ہی نہ جانے کیوں بجھ گئے دیئے گھر کے
ایک شعلۂ غم سے خاک ہو گئی محفل

نیشِ خار، پھولوں کے دل میں چبھ گیا جا کے۔
قافلے بہاروں کے لٹ گئے سرِ منزل!

ایک بار پہلے بھی تیرگی کے دامن میں
مرگِ نغمہ و گل پر آنسوؤں سے کھیلا ہوں!
آج تم نے پھر آکر سب دیئے جلائے ہیں
غمکدے کی دیواریں جگمگا اٹھی ہیں پھر

....

پس و پیش

خلش ہے مرگِ تبسّم کی میرے پہلو میں
جلو میں رفتہ بہاروں کو لے کے آئی خزاں
کوئی نہیں بھری دنیا میں ہم نفَس میرا
وہ راہرو ہوں جسے ہر قدم پہ ہے یہ گماں
یہ سنگِ میل کہیں سنگِ رہ نہ بن جائے
کہیں فریب نہ ہو شوقِ منزلِ جاناں
کہیں نہ ظلمتِ شب گھیر لے سرِ منزل
سیاہ رات نہیں میرے درد کا درماں!

یں ارضِ لالہ و گل چھوڑ تو نہیں آیا
یہ خارزار نہ ہو جس کی سمت لپکا ہوں!
ہر ایک گام پہ یہ سوچ کر سنبھلتا ہوں
یہ راہِ مرگ نہ ہو اور تو بے خبر رہ جائے
متاعِ یک نفسِ سوختہ بھی کھو بیٹھے
جلا نہ دے ترے ہونٹوں کو آتشِ گلِ نو

....

تاریک سیّارہ

" ہر فرد اس تاریک سیارے کی
مخلوق ہے۔ ہر فرد نے اس تاریک
سیارے کو اپنے دل میں چھپا رکھا
ہے، اس چٹان کے سینے سے روشنی
کی کرن کب پھوٹے گی، آج سورج
بھی اندھا ہو چکا ہے "

"جانِ من حجلۂ تاریک سے نکلو، دیکھو
کتنا دلکش ہے سیہ رات میں تاروں کا سماں
آسماں چھلکے ہوئے جام کے مانند حسیں
خُلد میں دودھ کی اک نہر سی ہے کاہکشاں"

"آسماں خود ہی نگوں سر ہے اسے کیا دیکھوں
رات کے پاس ہے کیا مرگِ تبسم کے سوا
جس کے ذرّوں میں ہے اب تک مرے ماضی کا لہو
میں نے باندھا ہے اسی خاک سے پیمانِ وفا"

"دن کے واماندہ، اسی دامنِ شب میں اکثر
اپنی منزل کے حسیں خواب میں کھو جاتے ہیں
یا کسی سادہ و پرکار کی میٹھی یادیں
اپنے پہلو میں دبائے ہوئے سو جاتے ہیں"

"میں بھی کھیلا ہوں تصور سے کسی کے برسوں
میں بھی اک حلقۂ صد رنگ کا زندانی تھا
اب مگر چاہتا ہوں دُرطۂ شب سے نکلوں
وہ بھی دن تھے کہ کوئی وجہ پریشانی تھا"

"رات کے پاس ستارے بھی ہیں، سیارے بھی
دامنِ شب میں اندھیرا ہی نہیں نور بھی ہے
ایک سیارہ محبت کی نئی دنیا ہے
جس میں ایمن بھی ہے موسیٰ بھی ہے اور طور بھی ہے"

"آسماں دور ہے نزدیک ہے یہ تودۂ خاک
جس کی آغوش میں ہیں رنگ کے چشمے رقصاں
جس میں ہے نکہتِ گل، بوئے سمن، بادِ نسیم
جس میں ہیں سبزہ و شبنم کے فسانے غلطاں"

"ہر نفس جس میں ہے پابندِ غمِ دورِ خزاں؟
صبح کی آنکھ میں اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
قسمتِ حسن ہے رسوائی ہر دو عالم
کائناتِ عشق کی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں"

"اور وہ سیارے جو ہیں میری نظر سے اوجھل
ان میں کیا سلسلۂ کشتی و طوفان نہیں؟
شیشہ و سنگ نہیں، شعلہ و شبنم بھی نہیں
تم یہ کہتے ہو کہ اس دنیا میں انسان نہیں"

"میری نظروں سے نہاں راز ہیں ابتک اس کے
اتنا معلوم ہے خوشیاں ہیں وہاں مست خرام
حسن و موسیقی نے اک جال سا بن رکھا ہے
سایۂ گل میں کوئی ہوگا مگر دستِ بہ جام"

"جی کو بہلایا فسانوں کا سہارا لے کر
خواب میں زلف و رخِ جانِ تمنّا دیکھا
آتشِ گل سے جلا ڈالے اندھیرے میں چراغ
ڈوبنے والوں نے کشتی کا تماشا دیکھا"

"ہر نفس خواب ہے، ہر خواب حقیقت کا فریب
اک تماشا ہے نگاہوں کا، نہ ماضی ہے نہ حال
آج ماضی ہے وہی دَور، جو فردا تھا کبھی
موت ملتی ہے تمنّاؤں کے چہرے پہ گلال"

"جو سمجھتے ہیں حقیقت کو محض نقشِ خیال
تم کبھی ہو، اور کبھی ہیں، ایک ہے انبوہِ کثیر
جو ابھی تک ہے پسِ پردۂ تاریکیٔ شب
جو ابھی تک ہے زمیں چھوڑ کے تاروں کا اسیر"

"خاکداں تیرہ و تاریک ہے، شمعیں بے نور
اس اندھیرے میں یہ کہتے ہو ستاروں سے نہ کھیل
میں اسے خواب نہیں بلکہ حقیقت سمجھوں
مجھ سے یہ کہتے ہو، نادیدہ بہاروں سے نہ کھیل"

"ساحلِ بحر پہ تسکین خزف ریزوں سے
وادیٔ مرگ میں نادیدہ بہاروں کی لگن؟
یہ اگر زادِ سفر ہے تو مسافر کے لیے
بالشِ خواب پہ بہتر ہے ستاروں کا کفن"

"اور کیا ظلم و جہالت کے درِ دولت پر
گر پڑوں خاک بسر، ناصیہ فرسائی کروں؟
چھوڑ کر دامنِ سیارہ و ماہ و انجم
حسنِ مغرور کے قدموں پہ جبیں سائی کروں"

"آسمانوں کی بلندی سے ہٹا کر نظریں
ظلم پروردہ بہاروں کی طرف دیکھو تو!
سب اسی ارضِ سیہ بخت کی خاطر ہیں کھیل
خاک پروردہ نظاروں کی طرف دیکھو تو!"

"چند مرجھائی ہوئی کلیاں ہیں، مسلے ہوئے پھول
درد سامان بہاروں کی طرف کیا دیکھوں؟
جو پلے ظلمت واماندہ کے گہوارے میں
ان نظر سوز نظاروں کی طرف کیا دیکھوں؟

"ظلمتِ خاک میں پوشیدہ ہے آبِ حیواں
قسمتِ سوختہ ساماں ہے بدلنے ہی کو رنگ
اور کچھ دیر لہو ہو لے دلِ خانہ خراب
محفلِ درد سے اٹھتے ہی کو ہے نغمۂ چنگ"

"پھر تصور نے تراشی ہے پناگاہ نئی
تودۂ خاک ہے کیا سامنے سیاروں کے
زندگی اب تو حنائے سرِ ناخن بھی نہیں
موت لو دینے لگی چہرے پہ بیماروں کے"

"آسماں دور ہے اب خوابِ گراں سے اٹھیے
ظلمتِ شب سے ہویدا ہیں سحر کے آثار
ایک سیارہ ہے یہ اپنی زمیں بھی لیکن،
اس کو انسان نے کر رکھا ہے خود تیرہ و تار"

خاک و خون

"خون خاک میں جذب ہو جاتا ہے،
اور شگوفہ بہار بن کر پھوٹتا ہے۔ تاریک
سیارے کے ہر تودۂ خاک میں اس
بہار آفریں مستقبل کی قوتِ نمو ہے۔
جو نئی انسانیت کی تمہید بن کر رہے گی۔

"کیا ہوئی آپ کی وہ گرمئ گفتار و نگاہ
اب نہ پہلی سی وہ باتیں ہیں نہ افسانہ کوئی
قہقہے سوگ میں ڈوبے ہوئے آنکھیں مغموم
جیسے صحرا سے چلا آتا ہو دیوانہ کوئی؟"

"وہ تھکا ہارا ہوں میں جس کو ہے سورج کی تلاش
مجھ سے یہ تیرگئ شب نہیں دیکھی جاتی
پھول مرجھائے ہوئے ڈالیاں بے برگ و ثمر
سرنگوں شاخ کوئی اب نہیں دیکھی جاتی"

"پر اسی تیرگیٔ شب میں ستارے بھی تو ہیں!
میں تو ہلکی سی کرن لے کے بھی جی لیتی ہوں
اس مسرت کے سہارے پہ جو آئے گی کبھی
کتنے ہی تلخ ہوں آنسو، انہیں پی لیتی ہوں"

"جگنوؤں ہی سے اندھیرے میں بہل جاتی ہو
موت پھیلائے ہوئے راہ میں ہے دام ابھی
ساتھ دے سکتے ہیں کب تک یہ سہارے یہ خیال
آدمی پوج رہا ہے وہی اصنام ابھی"

موت بڑھتی ہوئی طاقت سے نہیں لڑ سکتی
تیز دریا کی روانی میں خس و خاک کبھی
کتنی یورش کریں، دیوار نہیں بن سکتے
آپ ہوں، میں نہیں انسان سے مایوس ابھی

"مجھ کو دنیا کے خم و پیچ کا اندازہ ہے
جس کی بنیاد میں خوں ہے وہی تعمیر ہے یہ
جس کی دیوار ہی کج ہو وہ محل کچھ بھی نہیں
آدمی ہی کی تراشی ہوئی تقصیر ہے یہ"

"آپ کیا جانیے اس وہم سے کب نکلیں گے؟
منتظر راہ گزر، حسن شفق، نقش بہار
کتنی تسکین کا سامان ہیں آنکھوں کے لیے
دلِ بیتاب یہ کہتا ہے انہیں بڑھ کے پکار"

"اک بدلتے ہوئے رنگوں کا تلاطم ہے یہ سب
جن کی قیمت اسی انسان نے اتنی دی ہے
جونہی آنکھیں ادھر اٹھتی ہیں کہ بھر آتی ہیں!
ایک فریاد ہے جو روح نے اکثر کی ہے"

اور یہ زرد سے دانے جو شگوفوں کو لیے
پردۂ خاک سے آجاتے ہیں بالائے زمیں
شبنمی، سبز، لبادوں سے مہک دیتے ہوئے
ان کی نخوت کا بھی کیا آپ کو اقرار نہیں"

"سب خزاؤں کی امانت ہیں یہ نوزائیدہ
یہ شگوفے، یہ گل و لالہ و نسرین چمن
صبح ہنستی ہوئی آتی ہے بہاروں کو لیے
شام روتی ہوئی جاتی ہے لیے گردِ محن"

"آپ ہوں، میں نہیں انسان سے مایوس ابھی
ابھی چھوٹے ہیں شگوفے ابھی کمسن ہے بہار
شبنمی، سبز لبادوں سے مہک آتی ہے
خاک و خوں توڑ ہی دیں گے کبھی دیرینہ خمار"

(۱)

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گل
پھولوں کی زباں میں اک کہانی
ہر برگ و شجر سے کہہ رہا تھا
مقصود تھی دل کی ترجمانی
چہروں سے سرک رہے تھے آنچل
مصروف تھی کھیل میں جوانی
ہر عضو سے پھوٹتے تھے نغمے
آنکھوں سے شراب ڈھل رہی تھی

جسموں سے ابھر رہی تھیں تانیں
ہر پہلو میں آگ جل رہی تھی!

جب آنکھ کھلی تو موسمِ گُل
رنگوں کی گھٹاؤں میں گم تھا!

(۲)

چھاگل سے اٹھی جو تان غم کی
آنکھوں سے لہو کی دھار پھوٹی
سینے میں دھواں سا پیچ کھا کر
اس طرح اٹھا کہ آس ٹوٹی
سر جھک گیا داغ مسکرائے
تاریکی میں پھلجھڑی سی چھوٹی
وہ قوسِ قزح وہ دستِ رنگیں
کیا جانے سمٹ کے رہ گئے کیوں

اک سیمگوں رات میں نہ جانے
آنسو آنکھوں سے بہ گئے کیوں؟
میں تھا کہ بھٹک رہا تھا ہر سو
ہر خواب سلگ رہا تھا دل میں!

(۳)

اک وہم سے بیش تھا نہ کچھ بھی
ساحل تھا نگاہ میں نہ طوفاں
ہر چیز تھی رنگ و بو سے خالی
صحرا، کہسار اور گلستاں
میں خود ہی رنج و غم کا خالق
میں خود ہی تھا دست در گریباں
ہر چیز میں رنگ بھر رہا تھا
میں خود کو فریب دے رہا تھا
میں خود سے الجھ رہا تھا اب تک
خشکی ہی میں ناؤ کھے رہا تھا

پھر خواب سے چونک اٹھا سنبھل کر
ہر شے تھی حقیقت مجسّم!

(۴)

مغموم تھا وقت، رہ مسدود
چھائے ہوئے تھے سیاہ بادل
ہر نغمہ خموش ہو چکا تھا
پاؤں سے الجھ چکی تھی چھاگل
کملائے ہوئے تھے دستِ رنگیں
چہروں سے سرک چکے تھے آنچل
اک اور ہی سمت تھی نگاہیں
آنکھوں سے خیال بہ گئے تھے
تاباں تھی افق پہ خون کی لَو۔
اوہام سلگ کے رہ گئے تھے

تاروں کے سہارے چل رہے تھے
سورج کی تلاش میں تھے راہی!

ماضی (خزینہ کورس)

کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا

آدمی: رنگ و نور کی موجیں جس میں
رات کے بندھن توڑ چکی تھیں
ٹوٹ چکے تھے ظلم کے پھندے
پیار کے ناتے جوڑ چکی تھیں
جب تھی دنیا تاریکی میں
اس دھرتی پر سورج چمکا
دودھ کی دھاریں اس کی بوندیں
پی پی کر ہر پتہ جاگا

ماضی :- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا!

محبوبہ :- سب دھرتی کے بیٹے مل کر

گیت محبت کے گاتے تھے

اوروں کا سکھ اپنا سکھ تھا

اور کی آگ میں جل جاتے تھے

تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر

دھرتی ماں کا پیار جگاتے

جگمگ جگمگ کرتے دن میں

اپنی محنت کا پھل کھاتے

الفت کے بھوکے تھے سارے

خون کے پیاسے کیونکر ہوتے

جھوٹ اور لوبھ کا سودا کر کے

کیسے خود آرام سے سوتے

دھن دولت تھا، پیار کی باتیں

اپنے دن تھے ، اپنی راتیں

ماضی:۔ کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا

محبوبہ:۔ دریا جھرنوں اور چشموں سے
ہلکے ہلکے راگ ابلتے
جب سورج کی کرنیں پڑتیں
پھول اور کلیاں آنکھیں ملتے
میٹھی میٹھی نیند سے اٹھتے
دن جاتا اور رات کا راجا
نور کی کشتی لے کر آتا،
"چندا ماموں گیت سنا جا"
سب کہتے وہ پیار لٹاتا
دن کا سندیسہ دیتا جاتا

ماضی: کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا

(افق میں اک شور پیدا ہوتا ہے۔ چیخیں بلند ہو کر دب جاتی ہیں)

آدمی: ہری بھری کھیتی کا دشمن
اک پاپی باہر سے آیا

پیار کے رشتے ناتے توڑے
اس نے موت کا کھیل رچایا
آگ کی مدھم آنچ بڑھا کر
گھر پھونکے ہنستوں کو رلایا
ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ہوائیں
زہر ملایا، خون بہائے
لوہے کی زنجیریں ڈھالیں
نفرت کے پھل پھول لگائے
سچ پر جھوٹ، خوشی پر غم نے
اپنے اپنے تیر چلائے

ماضی:- کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دیس تھا اک پھولوں سے پیارا
محبوبہ: موت کا تحفہ لے کر آئے
باہر سے پاپی بیوپاری
ہار گئے الفت کے گاہک
مات ہوئے جیون کے بیوپاری

پیار بھری مٹی سے پھوٹے
آگ کے شعلے خون کے دھارے
ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ہوائیں
ناچے نفرت کے انگارے
رات ہوئی اور تاریکی میں
موت کے ظالم بازو پھیلے
سناٹے میں چیخ سی گونجی،
ابھرے سائے میلے میلے

ماضی: کچھ دن بیتے اس دھرتی پر دلیس تھا اک پھولوں سے پیارا

(ہر طرف ایک سناٹا چھا جاتا ہے)

آدمی:۔ موت کے شہر گونج رہے تھے
رات اندھیری، طوفانی تھی
نور کے بازو کانپ رہے تھے
راہ نئی اور انجانی تھی

آدمی:۔ اک باغی نے مشعل لے کر
مدّت کے مردوں کو جگایا
لے کر قبرستان میں آیا
(رات کی تاریکی میں مشعل آہستہ آہستہ
نمایاں ہوتی ہے اور قریب آتی جاتی ہے)

باغی:۔ اٹھو، نیند کے ماتو جاگو!
رات نے دن کو گھیر لیا ہے
دھرتی ماں کے بیٹو، جاگو!
ماں نے تم کو یاد کیا ہے
اس کی روح امر ہے لیکن
تم کو آج امر ہونا ہے
خون کی ہولی کھیل کے سونا
سُکھ کی نیند اگر سونا ہے
پیاسی مٹی دیکھ رہی ہے
اس پر جیون رس برسا دو

رنگ برنگے پھول کھلیں گے
سوئے ہوئے پودوں کو جگا دو
خون تمہارا رنگ لائے گا!
رات گئی اب دن آئے گا!

(مشعل نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے)

آدمی:۔ آگ اور خون کے فتنے جاگے
اور وہ نفرت کے بیوپاری
موت کا راگ سنانے اٹھے
جاگ اٹھے جیون کے پجاری
پھر پیاسوں کی پیاس بجھانے
پیم اور پیار کی جوت جگانے

(پس منظر سے ایک ساتھ بہت سی مشعلیں ابھرتی ہیں
باغی کی آواز کے ساتھ اور بہت سی آوازیں ہیں)

باغیوں کا گروہ:۔ رات گئی، اب دن آئے گا!
جاگ اٹھے ہیں نیند کے مانے

موت کے دروازے سے گزرو
آزادی کا گیت سنانے

دوسرا گروہ:- آزادی انسان کا حق ہے
ہر ذی روح کا ہر انساں کا
اب ہم موت سے ٹکرائیں گے
زور گھٹائیں گے طوفاں کا!

پہلا گروہ:- اس دھرتی کا ذرّہ ذرّہ
اپنے خون سے رنگیں کر دو
نفرت کے سب کانٹے چن لو
اور دنیا کو پیار سے بھر دو!

دوسرا گروہ:- آنے والی نسلوں کا دن
نور کا دامن پھیلائے گا
پھول بنیں گی نورس کلیاں
جب ننھا آدم آئے گا!

پہلا گروہ:۔ نور ہو تاریکی سے ابھرو
موت کے دروازے سے گزرو
آزادی کا گیت سناتے!
آزادی کا گیت سناتے!
آزادی کا گیت سناتے!

مستقبل:۔ اٹھو، نیند کے ماتو جاگو!
دھرتی ماں کے بیٹو جاگو!
آزادی کا گیت سناتے
آزادی انسان کا حق ہے
آزادی انسان کا حق ہے
آزادی انسان کا حق ہے

....

ابھی نہیں....!

ابھی نہیں ابھی منزل ہزار کوس ہے دور!
یہ ولولے، یہ مسرت، یہ ناتمام امنگ
یہ آب و رنگ سے بھرپور جام، نغمۂ چنگ
بہت ملیں گے ابھی رہ میں چشمہ ہائے سرور!

ٹھہر ٹھہر دلِ مضطر یہ ننگ و نام نہ کھو
جنونِ شوق کا کمبخت احترام نہ کھو
ہزار لالہ و گل سنگِ راہ بن جائیں
ہزار جسمِ فسوں گر نگاہ بن جائیں

ہزار پاؤں مسافت کے بار سے ہوں چور!
ابھی نہیں ابھی منزل ہزار کوس ہے دور!

طلوعِ صبح سے بے نور، شام غم کے لیے
غروبِ شام کی تاریکیوں سے ہو نہ ملول
ابھی فضا میں حلاوت نہیں ہے تلخی ہے
ابھی کھلا نہیں انسان پر وہ بابِ قبول
جہانِ تیرہ میں برسے جہاں سے رنگ و نور
ابھی نہیں ابھی منزل ہزار کوس ہے دور!

....

ایک پرتَو

قمر کی فرحت نواز کرنیں لیے ہیں آغوش میں وہ دنیا
جہاں ابھی محوِ خواب ہوں گی وہ سرمگیں غم فروز آنکھیں
ہر اک شجر سو گیا، زمیں پر لطیف کرنوں کے جال پھیلے
ہر ایک شاخِ خزاں رسیدہ کی پھیل کر رہ گئی ہیں باہیں!
خدا کی مخلوق سو گئی ہے فریب صبحِ بہار کھا کر
سکوں کے دامن میں فکرِ امروز گر پڑی ہے نڈھال ہو کر
مرے تخیل سے ایک پرتَو ابھر رہا ہے سوال ہو کر
یہ غم کی لہریں جو ہر تمنّا سے کھیلتی ہیں مآل ہو کر
یہ شب کی حسرت بدوش مستی جو چھوڑ دیتی ہے آزما کر
دیارِ محبوب کی خموشی کہیں تجھے سنگ ہی نہ کر دے!
حسین امیدوں کا یہ تلاطم ترے نفس میں نہ زہر بھر دے!

سکون

نہ زہر خند لبوں پر، نہ آنکھ میں آنسو
نہ زخمہائے دروں کو ہے جستجوئے مآل
نہ تیرگی کا تلاطم، نہ سیلِ رنگ و نور
نہ خارزارِ تمنا میں گمرہی کا خیال
نہ آتشِ گل و لالہ کا داغ سینے میں
نہ شورشِ غمِ پنہاں، نہ آرزوئے وصال
نہ اشتیاق، نہ حیرت، نہ اضطراب، نہ سوگ
سکوتِ شام میں کھوئی ہوئی کہانی کا
طویل رات کی تنہائیاں نہیں بے رنگ
ابھی ہوا نہیں شاید لہو جوانی کا
حیات و موت کی حد میں ہیں ولولے چپ چاپ
گزر رہے ہیں دبے پاؤں قافلے چپ چاپ

ریت کے محل

تجھے تو یاد نہ ہو گی وہ شام کہ جب آ گئیں
شفق کے رنگ میں لکھی ہوئی کہانی سی
مچل رہی تھی ترے رُخ پہ تیری آنکھوں میں
ترے لبوں پہ حکایت تھی اک کہانی سی
مجھے گماں ہوا جیسے میں وہ مسافر ہوں
جو رات دن کی مسافت کے بوجھ سے تھک کر
یہ چاہتا ہوں کہیں گوشۂ اماں مل جائے
جسے نہ زیست کا مقدور ہو نہ جائے مفر
جو ڈھونڈتا ہو اندھیرے میں اپنے گم کردہ
محبتوں کے ذخیرے دلوں کے سر لکے!

نہ سنگِ میل نہ راہوں میں قافلوں کے نشاں
بسی ہوئی ہو نگاہوں میں راہ کی سختی

ہر ایک گام پہ صحرا بدوش تھے ذرّے
بھٹک رہے تھے بگولے سے رہ نما لاکھوں
کہیں نہ چشمۂ شیریں نہ سایۂ اشجار
پڑے ہوئے تھے سرِ رہ شکستہ پا لاکھوں
جو اپنے دل میں کبھی شوقِ بے کراں لے کر
چلے تھے بارِ زمیں سوئے آسماں لے کر

دلوں کا درد، نگاہوں کا سوز کام آیا!
"دبارِ ہو" میں لبوں پر کسی کا نام آیا!

یہ کاروبار، یہ محفل، یہ ریگ زار، یہ دھوم
سرودِ نالہ کہیں، رقصِ ناتمام کہیں
صدائیں کھوئی ہوئیں وسعتِ بیاباں میں
طلوعِ صبح میں مل کر وہ رنگِ شام کہیں

حکایتِ گل و لالہ کے باب وا نہ ہوئے
کسی کے اشک بھی اس وقت آسرا نہ ہوئے

میں استخوانِ شکستہ کے ڈھیر سے بچتا
"دیارِ ہجر" میں پریشاں خیال آوارا
اسی تلاش میں پھرتا تھا کوئی رہ نکلے
اس اضطرابِ مسلسل سے پاؤں چھٹکارا

پھر ایک شام ترے حسنِ لازوال کی خیر!
صدائیں آئیں، ادھر آ، ترے مآل کی خیر!

پھر ایک بار تصور کے رنگ محلوں میں
ہجومِ شوق ہوا، شورِ ناؤ نوش ہوا
دیئے جلائے گئے، راستوں میں پھول بچھے
حیاتِ رفتہ کا افسانہ بار گوش ہوا

تڑپ کے ساز کے تاروں سے غم ربا نغمے
بساطِ خواب پہ انگڑائی توڑتے نکلے

سکوں نواز دھندلکا سا چھا گیا ہر سو
مرا یہ حال کہ جیسے کسی کو نیند آئے
خمارِ لطفِ مسلسل سے لڑکھڑایا میں
کنارِ ساز میں رقصاں تھے ہر طرف سائے
بڑھایا دستِ تمنا کہ دامنِ امید
کہیں نہ عالمِ وارفتگی میں چھوٹ جائے
تلاش کرتا ہوں وہ ساعتیں جو کھوئی تھیں!
بگولے کاٹ رہا ہوں ہوائیں بوئی تھیں!

نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں نہ وہ شب و روز
کبھی سمٹتی کبھی پھیلتی ہیں غم کی حدود
ٹھہر گئی ہے اک ایسے مقام پر دنیا
جہاں نہ رات نہ دن ہے نہ بیکلی نہ جمود!
پکارتے ہیں ستارے سنبھالتی ہے زمیں
ہر ایک شے سے گریزاں ابھی ہے میرا وجود
میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے
خزاں بدوشِ بہار و خمارِ زہر آلود!

نئی شاعری

دیکھ — !
بیٹھ گیا ہوں راہ گزر پر
گردِ سفر کا دامن پھیلا
ہونٹ پیاسے باہیں خالی،
دیکھ انسانوں کے رکھوالے
ڈھال رہے ہیں زنجیریں سی
چیکے چپکے خونیں قلمیں،
کھینچ رہی ہیں تصویریں سی

بے بس ذرّے کانپ رہے ہیں
روند دیا ہے تونے ان کو
آنکھ اٹھاکر دیکھ تو ظالم!
کوئی دل نہ ٹوٹ گیا ہو

اعادہ

کیا خبر تاب گفتگو نہ رہے
تو یہ لمحات پھر نہ آئیں گے
سانس لیتے ہیں چونک اٹھتا ہوں
رشتے نازک ہیں ٹوٹ جائیں گے

دن ڈھلا شام ہے اداس اداس
ایک منزل تو ختم ہو ہی گئی!
ایک موہوم راحتوں کی امید
تھک کے آغوشِ غم میں سو ہی گئی

ٹوٹ جائے گا یہ طلسمِ نظر
رنگ، تاروں کا چھوٹ جائے گا
فرصتیں کم ہیں وقت بیتے پر
کون آئے گا، کون جائے گا؟

سرِ رہگذارے

شبِ ماہ تو ہے سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے اثر بھی تو
یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
نہ ہٹا کسی کو سنبھل سنبھل
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنہیں حسن سے لگاؤ ہے
جنہیں زندگی بھی عزیز ہے

پندرہ اگست

یہی دن ہے جس کے لیے میں نے کاٹی تھیں آنکھوں میں راتیں
یہی سیلِ آبِ بقا، چشمۂ نور ہے، جلوۂ طور ہے وہ ؟
اسی کے لیے وہ سہانے مُدھر، رس بھرے گیت گائے تھے میں نے
یہی ماہ وش نشۂ حسن سے چوَر، بھرپور، مخمور ہے وہ؟

سنا تھا نگاہوں پہ وہ قیدِ آدابِ محفل نہیں اب
وہ پابندیاں دیدہ و دل پہ جو تھیں اٹھی جا رہی ہیں
وہ مجبوریاں اٹھ گئیں، ولولے راہ پانے لگے مسکرانے لگے اب
محبت کٹھن راستوں سے گزر کر لہکتی مہکتی ہوئی آ رہی ہے!

وہی کس مپرسی، وہی بے حسی آج بھی ہر طرف کیوں ہے طاری
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ میری محنت کا حاصل نہیں ہے
ابھی تو وہی رنگِ محفل، وہی جبر ہے ہر طرف زخم خوردہ ہے انساں
جہاں تم مجھے لے کے آئے ہو یہ وادیٔ رنگ ہے یہ میری منزل نہیں ہے

شہیدوں کا خون اس حسینہ کے چہرے کا غازہ نہیں ہے
جسے تم اٹھائے لیے جا رہے ہو یہ شب کا جنازہ نہیں ہے!

....

آزادی کے بعد

کہاں تو یہ تھا تصوّر ہی سے دل
جیسے ٹوٹنے والے تاروں کا غم تھا
کبھی نا دمیدہ شگوفوں کا ماتم
کبھی سوختہ لالہ زاروں کا غم تھا
کبھی بانجھ دھرتی میں بونا تھا آنسو
کبھی نا فریدہ بہاروں کا غم تھا
کوئی جن کی بھینی مہک چھین لے گا
کبھی مجھ کو ان گل عذاروں کا غم تھا
ٹھہرنا جنازہ کہاں رنگ و بُو کا
کبھی اپنے ہی غمگساروں کا غم تھا!

کہاں نشترِ بادو باراں سے ڈر تھا
کہ نورستہ پھولوں کو گھائل نہ کر دے
کہاں پنبہ در گوش مبہوت، پتھر
قدم خون آغشتہ مٹی میں گاڑے
کھڑا دیکھتا ہوں وہ نورستہ پودے
وہ نا آفریدہ بہاریں، شگوفے
وہ مہکی ہوئی سی دلہن بوستاں کی
زمیں نے سنواری تھی جس کی جوانی
اسے اپنی آغوش میں لے رہی ہے
محبت کی ماری کفن دے رہی ہے

(۲)

نہیں فرصتِ یک نگہ آدمی کو
سیاست کے بوئے ہوئے بیج پھوٹے
بزرگوں کی بوئی ہوئی فصل پکّی
اشارہ ملا اور مزدور جُھوٹے

نہ اُجرت کی پروا نہ خدشہ صلے کا
زراعت کی زد میں ہے ہر ایک پودا!
زمیں اتنی زرخیز میدان شاداب
یہاں بھی نہ پروان چڑھتا یہ پودا
یہاں بھی نہ پھلتے جو یہ بیج آخر
کہاں کی زمیں راس آتی انہیں پھر!
شب و روز بس کھیتیاں کٹ رہی ہیں
کہ ڈھانچوں کے خوشوں سے دھرتی پٹی ہے
بجیں شادیانے، منیں رنگ رلیاں!

(۳)

اٹھو ساکنانِ تہِ ارضِ اسفل،
ابھی تک نہ جانے ہو کس نشہ میں چُور
سنو، آسماں بوس شہرت کے مینار
ہر اک قریہ و شہر ہے جن سے معمور

دلوں کی کثافت کو دھو ڈالتا ہے

جہاں سے سدا پھوٹ کر چشمۂ نور

تمہارے مرے رہنما اور خداوند

بلاتے ہیں ہم سب کو با چشمِ پُر نم

ہمارے سروں پر رہے ان کا سایہ

ہمیں اپنا ان کو زمانے کا ہے غم!

انھیں کے توسّل سے ہم سگ برادر

بھری بستیاں پارۂ استخواں پر

کھنڈر میں بدل ڈالنا سیکھتے ہیں

انھیں کا کرم ہے کہ ہم فتنہ پرور

ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے!

اٹھو ساکنانِ تہِ ارضِ اسفل

وہ شہرت کے مینار پھر جگمگائے

فضاؤں میں پاکیزہ آواز گونجی
ہمارے خداؤں کی، سر کو جھکائے
ہمیں کیا شجر اور حجر سن رہے ہیں
خداوند مینار سے مسکرائے
اٹھو اپنے چنگال و دنداں کو دیکھو
اگر اب نہ چمکے تو کس کام آئے

(۴)

بہائم نے تہذیب کی پوستینیں
جو لادے چلے آئے تھے پھینک دی ہیں
تمدّن پہ فرماں ہے جنگل کا نافذ
محبت نے آنکھیں ابھی بند کی ہیں
ابھی نیند آئی ہے انسانیت کو!

یہ کہگل جو اس خون مٹی سے مل کر
بنیں، کس عمارت کی بنیاد ہو گی،

وہ دھرتی جہاں آگ بوئی گئی ہے
ہوئی بھی تو کس طرح آباد ہوگی
یہ خونیں کہانی جو لکھی گئی ہے
مجھے یاد ہے کل کسے یاد ہوگی؟

(۵)

سوا نیزے پر آگیا آج سورج
لیے بائیں ہاتھوں میں اعمال نامے
گنہگار حیران و ششدر کھڑے ہیں
کہ اندھے ہیں سب کون گرتوں کو تھامے
عجب نفسی نفسی ہے، پیشانیوں میں
ہیں پیوست آنکھیں، سب اپنے پرائے
اُجالے کی تاریکیوں سے ہیں نالاں
مگر کون کس کو غمِ دل سنائے
اُبلتے ہیں سر، ہانڈیاں پک رہی ہیں!

(۶)

سنو اے خداؤں کے محبوب بندو
بہایا ہے جن کی محبت میں تم نے
لہو، جسم یوں کاٹ ڈالے کہ جیسے
کوئی سوکھے پیڑوں کے تن کاٹ ڈالے!
وہ ناقوس اور گھنٹیاں مندروں کی
وہ مغموم اور دکھ بھری داستانیں
تعاقب میں دوڑی چلی آرہی ہیں
فضاؤں میں تھرّا رہی ہیں اذانیں

(۷)

صنم ساز و اصنام رونے ہیں تم کو
یہ مکروہ اوراق تاریخ کے جو
تمہارے قلم نے رنگے ہیں، انہیں کیوں
ہمارے لیے چھوڑ کر جا رہے ہو؟
یہ بارِ گراں ساتھ لے جاؤ اپنے!

یہ مکروہ اوراق تاریخ کے جو
تمہارے قلم نے رنگے ہیں مسلسل
لہو بن کے تڑپیں گے ان کی رگوں میں
جو آئیں گی نسلیں ۔ یہ بد ذائقہ پھل
جسے اتنی محنت سے بویا ہے تم نے
تمہارے جگر بندہ اولادِ اُن کی
اور اولادِ ان کی کفن سر سے باندھے
مزاروں کے سائے میں کھاتی رہے گی!

(۸)

مبارک ہوائے شور، بنجر زمینو
کہ تم نے جلی کوکھ پائی مبارک!
جو شاداب و زرخیز تھیں وہ زمینیں
زقوم اور حنظل جنے جا رہی ہیں
جواں روح، سیراب جاں، تر زمینیں
ہری کوکھ سے خار و خس جن چکی ہیں،

بگولوں سے بھرپور ہیں سبز میداں!

(۹)

چمکتے تھے کل تک جو تاریکیوں میں
وہی چشمۂ نور، روشن ستارے
وہ بوسے تمہارے، جو تم نے دیئے تھے
کبھی پیار سے ان کی پیشانیوں کو
مقدس محبت کی پہلی نشانی
امانت جو ماؤں نے بیٹوں کو دی تھی
وہ چاند اور سورج کہاں کھو گئے سب؟

تمہارے سپوتوں نے اے ماؤ بہنو؟
جو کل تک تھے معصوم اور بھولے بھالے
تمہارے ہی حرم پہ کیوں ہاتھ ڈالا
یہی تھے تمہاری فغاں سننے والے؟

اگر جانتی تھیں آلِ محبت
تو کیوں اپنے ہی دودھ سے ناگ پالے

ہرے لہلہاتے ہوئے کھیت اپنے
یہ فردا کی مسموم امید گاہیں،
بنے جیسے ناقابلِ کشت کردو
نہ پھیلا سکیں خار وخس اپنی باہیں
زقوم اور حنظل نہ پیدا ہوں ان میں

(۱۰)

مہک آئی آلودہ خوں پیرہن کی
مجھے اپنے دامن میں لے، ماں اندھیرا
مری سمت بڑھتا چلا آرہا ہے
مرے بھائی جن پر بھروسہ کیا تھا
چھپائے ہوئے آستینوں میں خنجر
مجھے پیار سے لوریاں دے رہے ہیں

(۱۱)

گلوں سے الجھتی ہوئی شوخ کرنو!
نئے نرم پودوں کی معصوم روحو
یہاں سے ذرا اور آہستہ گزرو
وہ درماندہ شاعر جسے آدمی نے
کئی بار چاہا کہ مایوس کر دے
تمہارے لیے ہی جو تڑپا ہے برسوں
تمہاری اسی روز کی رہ گزر میں
اسی دامنِ خاک میں سو رہا ہے!

....

غلام روحوں کا کارواں

غلام روحوں کے کارواں میں
جرس کی آواز بھی نہیں ہے

اٹھو تمدّن کے پاسبانو!
تمہارے آقاؤں کی زمیں سے
اُبل چکے زندگی کے چشمے
نشان سجدوں کے اب جبیں سے
مٹاؤ۔ دیکھو چھپا نہ لے وہ
لہو ٹپکتا ہے آستیں سے!

غلام روحوں کے کارواں میں
نفس کی آواز بھی نہیں ہے

اٹھو، محبت کے پاسبانو!
یہ کوہ وصحرا، یہ دشت و دریا
تمہارے اجداد گا چکے ہیں
یہاں پہ وہ آتشیں ترانا
جو گرمئ بزم تھا مگر اب
گزر گیا اس کو اک زمانہ

سمندِ ایام برق پا ہے
اٹھو، کہ تاریخ ہر ورق پر
تمہارا شبھ نام ڈھونڈتی ہے
نہ دیں گے آواز اس کے شہپر
جو وقت اُڑتا چلا گیا ہے
زمین آنکھوں سے مت کریدو!
نہ مل سکیں گی وہ ہڈیاں جو
زمیں کا تاریک گہرا سینہ

نکل چکا ہے — نیا قرینہ
سکھاؤ پامال زندگی کو

اٹھو! مزاروں کے پاسبانو!
چلو نہ گرماؤ زندگی کو

یہ ڈھیر سونے پڑے ہیں، ان پہ
کہیں سے دو پھول ہی چڑھادو!

پیمبرِ گل

فسانۂ گلِ رنگیں قبا و نغمۂ شوق
طویل ڈھلتی ہوئی رات، انتظار کے گیت

تڑپ کی آگ میں جلتے ہوئے زمان و مکاں
مئے نشاط میں بھیگے ہوئے خمار کے گیت

مزہ نہ دیں گے ابھی ان کو احتیاط سے چھیڑ
خزاں نصیب ابھی تک ہیں، بہار کے گیت

فسانۂ گلِ رنگیں قبا نہ چھیڑ ابھی
حکایتِ بتِ سیمیں عزار رہنے دے
نگاہ و دل پہ مرا اختیار رہنے دے
الم نصیب جنوں سو گیا نہ چھیڑ ابھی
نہ پا سکے گا جو میں کھو گیا، نہ چھیڑ ابھی

گزرنے والا ادھر سے ہے اک پیمبرِ گل
جلو میں اپنے لیے قافلے بہاروں کے
سکوں نواز حسیں گیت چاند تاروں کے
لطیف چھینٹے ہوئے رنگ آبشاروں کے
نفس سے جس کے مہک جائیں گے خس و خاشاک
نگہ پہ بار نہ گزرے گا جلوۂ بے باک
زمیں کی شام کو ہم رنگِ صبح کر دے گا
بھکاریوں کی تہی جھولیوں کو بھر دے گا
اسی پیمبرِ گل کا ہے انتظار مجھے
نہ جانے کب سے سرِ رہ گزار بیٹھا ہوں

برس گزر گئے امید وار بیٹھا ہوں
وہ آئے گا ابھی اتنا ہے اعتبار مجھے

نگہ سے کھیلتی ہے مرگِ نغمہ ہائے شوق
خزاں کی یورشِ پیہم کا رنگ دیکھ چکا
زمیں پٹی ہوئی پھولوں کی زرد لاشوں سے
کہاں کہاں ہوئی گھائل امنگ، دیکھ چکا
لیے لیے پھرا اک بار اپنے کاندھوں پر
وبالِ دوش ہوا سر کہ سنگ دیکھ چکا!

لہو لہان امیدیں جنوں کا دامن چاک
شریکِ حال کوئی تھا تو دیدۂ نمناک!

ستم زدوں کو نوید بہار دے گا کوئی
اس اعتبار پہ جینے کی آرزو بھی ہوئی

بگڑ چکے جو مقدر سنوار دے گا کوئی
اک اس خیال سے اس دن کی جستجو بھی ہوئی
طلوع ہوگا کہیں سے جب آفتاب نیا
زمیں سے پھوٹ پڑیں گے شگوفہ ہائے رنگ
نئے نہال، نئی کونپلیں، نئے پھل پھول
نگارِ صبح کے ہنگامہ ہائے شوخ و شنگ
جو زیرِ خاک ہیں پودے انھیں جگائیں گے
یہ نرم ہاتھ جو نہی ان کو گدگدائیں گے
وہ آنکھ ملتے ہوئے لیں گے ایک انگڑائی
ہزار ناز سے پھر ایک سبز پیراہن
پہن کے نیستی سے آئیں گے زندگی کی طرف
اندھیری گود سے معصوم روشنی کی طرف
یہ راگ بکھرے ہوئے دور تک فضاؤں میں
یہ گردوپیش میں کہیں گھنگھروؤں کی سی آواز
یہ رنگ سمٹے ہوئے زیرِ دامنِ گل تر
یہ رقص کھونے دلوں کے ہر سمت، یہ چمن کا ساز

مہک اڑی ہوئی غنچوں کے نرم ہونٹوں سے
گلوں کے چھلکے ہوئے جام کا لطیف خمار
سمیٹتا ہوں انھیں اپنے تنگ دامن میں
کہ دینے آئے گا جس وقت وہ پیامِ بہار
لٹاؤں گا انھیں اس وقت اس کے قدموں پر

سجائے ہیں در و دیوار وہ خدا کے جمال
جو آگیا مرے ظلمت کدے میں کیا ہوگا
سیاہ خانے کا ہر گوشہ جگمگا اٹھا
سجائے ہیں در و دیوار بہرِ استقبال

جنگ

میں نے دیکھا ہے ٹپکتے رگِ آہن سے لہو
سنگ پاروں سے ابلتی ہوئی دیکھی ہے شراب

میں نے دیکھا ہے سرِ شاخ پہ ہنگامِ بہار
آتشِ گل سے جھلستے ہوئے خود برگِ گلاب
میں بھی اُس بھیڑ میں تھا جو سرِ مقتل آئی
پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

مرگِ انبوہ میں بھی جشن کا ساماں نہ تھا
کوئی ایسا نہ تھا جو جامِ مئے تر بکھرے
سر بہ زانو تھا کوئی، خاک بسر تھا کوئی
محفلِ زیست میں بجھتا سا شرر تھا کوئی

وسطِ مشرق کی یہ خندق تھا مقدر جن کا
ان میں سے ایک نے اک روز کہا تھا مجھ سے
میں نے باندھا تھا کسی شوخ سے پیمانِ وفا
اُن گھنی پلکوں میں وہ پیار سے بھرپور آنکھیں
ڈبڈبا آئیں، چھلک اُٹھیں، ستارے ٹوٹے
میں جو رخصت ہوا، جلتے ہوئے رخساروں پہ

چھا گیا شام کا رنگ، اور سہارے ٹوٹے
اُس کے ہونٹوں پہ کوئی بات تھی میں سن نہ سکا
میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کہیں روک نہ لے
کیا خبر کہتی ہو اک موت کا جھونکا آیا
ایک گولی نے کیا ختم کہ افسانہ سُنے
کون اس سوختہ جاں سوختہ تن کا، چھوڑ دو
بھاگ کر چھپ گئے ہم اپنی کمیں گاہوں میں
کھینچ کر ڈال دیا اس کو اسی خندق میں
دفن تھے جس میں کئی ایسے فسانے کب سے
دفن ہوتے ہی چلے آئے تھے جانے کب سے

میں نے سوچا کبھی مل جائے، کہوں گا اس سے
حاکمِ وقت کا نشا تھا ۔ محبت کی جگہ
اس کو نفرت ملے، نفرت ہے ابھی لطف، خرام
جس جگہ جاؤ وہاں شرق میں بھی غرب، میں کبھی
وسطِ مشرق کی زمیں نے تجھے بھیجا ہے سلام

سوالیہ نشان

دہقان سنوارتا ہے مٹی
چن چن کے بکھیرتا ہے دانے
اور سوچتا جاتا ہے جی میں
پھر آئے گی جنگ ۔ آزمانے؟
اور دل کو ٹٹولتا ہے رک کر
پھر دور افق کو دیکھتا ہے
کچھ رنگ سے تیرگی میں ڈوبے
مجبور افق کو دیکھتا ہے

آنکھوں میں لہو کی بوند کانپی
گرتے ہی زمیں پہ کھو گئی پھر
پروان چڑھائے تھے جو پودے
وہ جل گئے رات ہو گئی پھر

خالی کئی گوشے ہو گئے ہیں
تنہا تو نہ تھا، پہ رہ گیا ہے
کرنا پڑا انیشِ غم گوارہ
کس کس کا نہ خون بہہ گیا ہے

پھر دُور اُفق کو دیکھتا ہے
یہ کھیت، یہ وسعتِ بیاباں
سرسبز زمین کے یہ پھل پھول
یہ سبزۂ تازہ، یہ خیاباں
سب آگ میں جل رہے ہیں گویا
تھم تھم کے پگھل رہے ہیں گویا

دہقان سنوارتا ہے مٹی،
رُک رُک کر بکھیرتا ہے دانے
اور سوچتا جا رہا ہے جی میں
پھر آئے گی جنگ آزمانے!

جنگ

ہم نے اس لاش کو بے گور و کفن چھوڑ دیا
ارضِ مغرب تہی آغوش تھی شاید اس کو
بھینچ لے پیار سے اور لوریاں دے دے کے کہے
"میں زمیں ہوں، مجھے ہر رنگ میں تم پیارے ہو!
میں یہ تفریق نہ کر پاؤں گی کس مٹی نے
تم کو پالا، تمہیں پروان چڑھایا تھا کبھی
یہ خد و خال ہیں کس گود کے پروردہ، تمہیں
کس نگہِ سوز نے محبوب بنایا تھا کبھی
میری اولاد ہو تم شرق میں بھی غرب میں بھی
میں زمیں ہوں مجھے ہر رنگ میں تم پیارے ہو!

میرے دریا مرے پھل پھول، مرا سبزۂ شوخ
سب تمہارے لیے ہیں چھین جھپٹ ہے پھر کیوں،

تم مرے لطف و محبت کے نگہبان ہو سب
آپ ہی آپ مگر لاگ لپٹ ہے پھر کیوں
اتنی دور آئے تھے کیوں موت اگر پیاری تھی؟
تم نہ کچھ اپنے ہی کام آئے نہ غیروں ہی کے کام
جن پہ تم چھلتے تھے وہ بھی تو کوئی غیر نہیں
رشتۂ خوں ہے وہی صرف ہیں بدلے ہوئے نام
تم تھکے ہارے ہو گم کردۂ رہ ہو سو جاؤ
صبح ہو جائے گی تاریکیٔ شب میں کھو جاؤ

مجھ سے یوں چھوٹ گیا میرا وہ برسوں کا رفیق
گویا مٹی کا کھلونا تھا کہ توڑا، پھینکا
ہم بھی اس لاش کو بے گور و کفن چھوڑ گئے
موت نے زیست کو چپکے سے جھنجھوڑا، پھینکا

اک گھنے پیڑ کی پھیلی ہوئی، بوجھل شاخیں
ٹوٹ کر گرنے لگیں شعلۂ جوالہ اٹھا

پتیاں، پھول، ہری ڈالیاں پھولوں سے لدی
سب ہی کچھ جلنے لگا، جل کے یونہی خاک ہوا

یوں نہ کہو

کبھی نہ اس کے بھاگ کھلیں گے پیاسی مٹی رہے گی پیاسی
یوں نہ کہو مرجھائے پودے یونہی سدا مرجھائے رہیں گے
چلتے چلتے اس منزل میں آکر دھرتی تڑک جائے گی
یوں نہ کہو گہنائے سورج یونہی سدا گہنائیں رہیں گے
تم تو شفق کے گھلتے ملتے رنگوں کی اک گلکاری ہو
تم تو سحر کا ہلکا ہلکا نور رہو جس سے دنیا جاگے
تم تو مہک ہو کھلتے پھول کی چڑھتے دن کا اُجلا پن ہو
تم نے تو سلجھائے ہیں آ کر ذہن کے کتنے الجھے دھاگے
تم کو ہم نے اپنا کہا ہے تم تو یوں نہ کہو، زنداں کے
کبھی نہ بھاری قفل کھلیں گے، کبھی نہ زنجیریں ٹوٹیں گی۔

اندوختہ

گہرا نیلا، بسیط و بلند آسماں
اتنا خاموش، ٹھہرا ہوا، پُرسکوں
اس طرح دیکھتا ہے مجھے، جیسے میں
اپنے گلّے سے بچھڑی ہوئی بھیڑ ہوں!
تم کہاں ہو مری روح کی روشنی؟
تم تو کہتی تھیں، یہ درد پائندہ ہے
تم کہاں ہو بہشت نگہ مہر من؟
تم سے اب تک مری داستاں زندہ ہے
تم کہاں ہو؟ مرے راستوں کے دیے
بجھ گئے، پھر بھی ہر چیز تابندہ ہے
بس ملوں کارخانوں کے بوجھل دھوئیں
قحبہ خانوں کی مغموم تابندگی
کاہنوں کی محبت، کا فضا، جیسے

ربِّ موجود و معدوم نے بخش دی
دائمی زندگی، میں تمہارے لیے
عہدِ فاروں کی گیرا در دار سے
اپنی زخمی محبت بچا لایا ہوں!

سلسلے

شہر در شہر، قریہ بہ قریہ
سالہا سال سے بھٹکتا ہوں
بارہا یوں ہوا کہ یہ دنیا
مجھ کو ایسی دکھائی دی جیسے
صبح کی ضو سے پھول کھِلتا ہو
بارہا یہ ہوا کہ روشن چاند
یوں لگا جیسے ایک اندھا کنواں
یا کوئی گہرا زخم رِستا ہو
میں ہر اک حال میں بھی زندہ ہوں
اور کل سوچتا رہا پہروں
مجھ کو ایسی کبھی لگن تو نہ تھی—
ہر جگہ تیری یاد کیوں آئی

محبت

رات میں دیر تک اڑتے بادل کھلے چاند کی کشمکش
ٹکٹکی باندھ کر ایسے دیکھا کیا جیسے یہ ماجرا
میری ہی داستاں کا کوئی پارہ ہے، کون آوارہ ہے
تو کہ میں؟ ایک چھوٹا سا طائر فضا میں تھا نغمہ زا
دور، نزدیک، پھر دور ہر سمت اک تان کی گونج تھی
رات آہستہ آہستہ رک رک کے ایسے گزرتی رہی
جیسے میں اور تو وقت کی وادیوں سے گزرتے ہوئے
شہر کی سونی، سنسان، خاموش گلیوں میں گم ہو گئے!
رات کی کالی دھاری سے دن کی سپیدی الگ ہو گئی
دونوں اک دوسرے سے الگ ہو گئے، ہاں وہ ماجرا مگر
یونہی لگاتار ہا، اڑتے بادل کھلی چاندنی کا رواں
وقت کے ساتھ ساتھ آپ تبدیل تحلیل ہوتا رہا
میں تجھے تو مجھے ڈھونڈتی رہ گئی، وقت اڑتا گیا
ان خنک، سانولی بھیگی راتوں کی بے شوق تنہائیاں

صرف اک داغِ غم تاب کی شکل میں منجمد ہو گئیں
پر وہ نغمہ، وہ حسنِ زمین و زماں، روشنی
اس پرندے کی وہ دھیمی آواز اور میٹھی کلکاریاں
بنتِ آغاز و انجام کے باکرہ بطن میں رہ گئیں!
اور اک نسل سے دوسری نسل تک عکسِ روحِ ازل
عکسِ روحِ ابد ایسے نشو و نما پائے گا خون میں
جیسے بنجر زمیں قطرۂ ابر سے سبز و شاداب ہو!
اڑتے بادل کھلی چاندنی کا سماں، میٹھی تنہائیاں
سب کی سب بن کے مٹتی ہوئی پیاری تصویریں ہیں
صرف تبدیل ہوتی ہوئی روشنی کی جھلک زندہ ہے
صرف حسنِ ازل اور حسنِ ابد کی مہک زندہ ہے
صرف اس طائرِ خوش ادا خوش نوا کی لہک زندہ ہے
ایک دن آئے گا تو بھی مر جائے گی میں بھی مر جاؤں گا!